R. No. 2186/57 Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

۲۲ فروری ۱۹۶۵ء | ایڈیٹر: آل احمد سرور | جلد ۲۴ - شمارہ ۸

اداریہ

مولانا آزاد کی ساتویں برسی

آج مولانا آزاد کے انتقال کو سات برس ہو گئے جب تک پنڈت جواہر لال نہرو زندہ تھے، یہ محسوس ہوتا تھا کہ مولانا آزاد کی روح اب بھی حکمراں ہے۔ نہرو کے مرنے سے ایک طرح آزاد بھی دوبارہ مر گئے۔ نہرو اپنی ذات سے آزاد کے نقطۂ نظر کو بھی برابر آگے بڑھاتے رہے۔ اب نہرو کے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ وہ نہرو اور آزاد دونوں کی مثال کو برابر سامنے رکھیں۔ یہ مثال انھیں راستے کے بہت سے کانٹے نکالنے میں مدد دے گی۔

مثلاً آزاد زندہ ہوتے تو شاید زبان کے مسئلے پر وہ ہنگامہ نہ ہوتا جو حال میں ہوا۔ مولانا اس سلسلے میں نہایت واضح خیالات رکھتے تھے۔ وہ صاف کہتے تھے کہ ہندی کو بالآخر انگریزی کی جگہ دینی ہے مگر انگریزی کو ہٹانے کے معاملے میں جلد بازی کے وہ حامی نہ تھے۔ وہ سب قومی زبانوں کا فروغ چاہتے تھے۔ انھوں نے مرنے سے ایک ہفتہ پہلے انجمن ترقی اردو ہند کی کل ہند کانفرنس میں صاف کہا تھا کہ اردو کو اس کا حق ضرور ملنا چاہیے لیکن اس حق کا ہندی سے کسی طرح کا کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔

مولانا اول و آخر ہندوستانی تھے اور اول اور آخر مسلمان تھے۔ ان کے یہاں قومیت اور مذہب کے تصادم کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ سیاسی معاملات میں مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں سوچتے تھے۔ مذہبی معاملات میں سیاسی مصلحت انھیں پسند نہ تھی۔ وہ ہندوستانی تہذیب کی وحدت کے قائل تھے اور برابر کہتے رہتے تھے کہ اس وحدت پر اس کی رنگارنگی سے کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ رنگارنگی اس وحدت کو اور معنی خیز بناتی ہے۔ وہ عربی، فارسی اور قدیم علوم کے بہت بڑے عالم ہوتے ہوئے جدید اور ترقی پسند ذہن رکھتے تھے اور ہر نئی ذہنی تحریک کا خیر مقدم کرنے کو تیار رہتے تھے بشرطیکہ اس میں صحت مند میلانات ہوں۔ وہ اردو کے بہت بڑے ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ان کے سے خطیب اور مقرر بہت کم گزرے ہیں، لیکن مخصوص حلقوں میں ان جیسا معاملہ فہم اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے والا بھی نہ تھا۔ انھوں نے قومی زندگی کی ہر کروٹ کا ساتھ دیا۔ وہ خطرے کا مقابلہ کرنے میں بھی سب سے آگے رہے۔ انھوں نے آزادی کی لڑائی میں گاندھی اور نہرو کے ساتھ کام کیا اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ اقلیتوں کے مسائل کو وہ جس طرح حل کرتے تھے اس کی روداد سکھوں سے پوچھیے۔ مرکزی وزارتِ تعلیم میں اب بھی ان کے فیصلوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد کو یاد رکھنا، ان کے کارناموں سے نیا عزم اور ولولہ لینا، ان کی طرح قوم کی اصلاح و فلاح کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا، ان کی سی ذہن کی صفائی اور کردار کی پختگی پیدا کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ جن قدروں کو انھوں نے

اس شمارے میں

عزیز رکھا وہ ہمیں بھی سینے سے لگانی چاہئیں۔ وہ جس تہذیب کے نمائندے تھے، اس تہذیب کی حفاظت کرنا، وہ جس زبان کے ادیب تھے، اس کی ترقی کے لیے گنجائش نکالنا آج ہمارا قومی فریضہ ہے۔ حکومت اور عوام دونوں کو اس فریضے سے کسی حال میں غافل نہیں رہنا چاہیے۔

سیاسیں

۲۶ جنوری سے ہندی مرکز کی سرکاری زبان ہوئی اور انگریزی شریک زبان۔ لیکن مرکز کی کچھ وزارتوں نے صرف ہندی میں اعلانات شائع کرنے شروع کر دیے۔ اس پر احتجاج بھی ہوا۔ مدراس میں جو ہنگامے ہوئے ہیں ان کی روشنی میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ انگریزی کو شریک زبان قرار دینے کے لیے پنڈت نہرو کی یقین دہانی کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ اس کی پوری تصویر سامنے آتے آتے تو دیر لگے گی لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ زبان کے مسئلہ پر ہنگامہ کیوں ہوتا ہے۔

حال میں انکم ٹیکس کے جو فارم لوگوں کو دیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنی آمدنی اور بازیافت کی رقم بھریں، وہ صرف ہندی میں ہیں۔ ڈاک خانے میں منی آرڈر کے فارم اب زیادہ تر صرف ہندی میں ملتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ انکم ٹیکس کے فارم یا تو انگریزی اور ہندی دونوں میں ہونے چاہئیں یا ہندوستان کی چودہ زبانوں میں۔ اسی طرح ڈاک خانے کا سارا کاروبار یا تو انگریزی اور ہندی دونوں میں ہونا چاہیے یا چودہ زبانوں میں۔ پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ سب کو سہولت ہو۔ کسی خاص زبان سے ہمدردی کے یہ معنی کیسے ہوئے کہ جو لوگ جو زبان نہیں جانتے وہ مشکل میں پڑ جائیں۔ جمہوریت کے معنی سب کی برابری کے ہیں۔ برابری بھی نہ ہو اور برابری بھی رہے، یہ کیسی منطق ہے؟

پنڈت آنند نرائن ملا کو ان کے مجموعہ کلام "میری حدیث عمر گریزاں" پر ساہتیہ اکاڈمی کا انعام ملا۔ اس سلسلے میں دہلی میں آپ کے اعزاز میں کئی جلسے ہوئے۔ ایک جلسے میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ جلسے کے بعد ایک صاحب نے ملا صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں [illegible] شاعری ہے یا شاعری [illegible]۔ ملا صاحب نے یہ سوال راقم الحروف کی طرف پھینک دیا۔ راقم الحروف نے کہا کہ نظم میں شاعری کا اندازہ تو قارئین کر سکتے ہیں، لیکن شاعری میں بھی ایک اچھی صفت ہے اور ملا صاحب کے یہاں اس کی وجہ سے ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی ملا جو بات کہتے ہیں وہ واضح ہوتی ہے۔ ان کے یہاں وہ ابہام نہیں ہے جس سے آپ جو چاہیں مطلب نکال لیں اور کبھی کبھار کوئی مطلب نہ نکال سکیں۔

ملا صاحب کا ایک لطیفہ ملاحظہ ہو۔ ایک دفعہ جگر صاحب نے انھیں مراد آباد کے ایک مشاعرے میں مدعو کیا۔ ملا صاحب جگر صاحب کے اصرار پر مشاعرے میں شریک ہوئے۔ جب آپ کے پڑھنے کی باری آئی تو جگر صاحب نے ازراہ محبت کہا کہ ملا صاحب آپ کی غزل میں پڑھوں گا۔ محبت کے علاوہ اس میں ایک حکمت بھی تھی۔ ملا صاحب کے مخصوص ترنم کی تاب صرف اہل ذوق ہی لا سکتے ہیں۔ عام مجمع ان کے زیر و بم میں اتنا الجھ جاتا ہے کہ شاعری کی خوبی پر اس کی نظر ہی نہیں جاتی۔ مگر ملا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ فرمانے لگے کہ میرے اشعار کے جو دلدادہ ہیں انھیں میرا ترنم بھی برداشت کرنا چاہیے۔ ان کی اس رائے سے ہر سنجیدہ آدمی کو اتفاق ہوگا۔

حکومت پنجاب اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرے گی

پٹیالہ۔ ۲۹ جنوری۔ کل پٹیالہ میں اردو کالج کا افتتاح کرتے ہوئے پنجاب کے وزیر تعلیم مسٹر پربودھ چندر نے کہا کہ حکومت پنجاب اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام کرے گی۔ آپ نے زبان کو آسان بنانے پر زور دیا اور ہندی کو سنسکرت زدہ اور اردو کو فارسی زدہ بنانے کی کوششوں کی مذمت کی۔

آپ نے عوامی تقریبات کی صدارت کرنے کے لیے وزیروں کو دعوت دینے کے جذبہ پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ جس نوعیت کی تقریب ہو اس کے فاضل اور ماہر کو ہی موقع دیا جانا چاہیے۔ آپ نے اردو کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔

اس سے پیشتر انجمن ترقی اردو پنجاب کے صدر مسٹر تیجونت رائے ساحر نے فرمایا کہ یہ کتنا غلط ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس زبان میں ستاون ہزار الفاظ ہیں اور ان میں دو تہائی الفاظ کا مخرج ہندی اور پنجابی زبانیں ہیں۔

(الجمعیۃ۔ دہلی)

ہندی کے بعد اردو کو دوسرا مقام ملنا چاہیے

نئی دہلی، ۷ فروری۔ انجمن ترقی اردو کی جانب سے یہاں پر ایک میٹنگ منعقد کی گئی جس میں اس بات پر اظہار افسوس کیا گیا کہ اردو کو فروغ دینے کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ اس میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ہذا کے سکریٹری شری گوپی ناتھ امن نے کہا کہ ہندی کے بعد اردو کو دوسرا مقام ملنا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ اس معاملہ میں انجمن کا ایک وفد صدر جمہوریہ اور وزیراعظم سے ملنے والا ہے۔

(الجمعیۃ۔ دہلی)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
(وس کان سن امریکہ)

نں یا ن

(گذشتہ سے پیوستہ)

شق (۵ ب) کے دیسی الفاظ سے نمٹ لینے کے بعد اب مستعار الفاظ کو لیجئے۔ اردو میں یہ سب کلاسیکی عربی سے آئے ہیں۔ فرانسیسی محقق کان ٹی نو (CANTINEAU) کا بیان ہے کہ کلاسیکی عربی میں نون اور نون غنہ کا وجود تھا۔ عرب کی جدید بولیوں کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ n (لثوی نون) تالوی اور غشائی آوازوں سے پہلے اکثر ŋ (غشائی نون) میں بدل جاتا ہے[1] ہمیں عربی کی جدید بولیوں سے سروکار نہیں۔ اردو میں ان تمام مستعار الفاظ کا تلفظ دیسی الفاظ سنگا، منگا کی طرح لثوی نون ہی سے ہوتا ہے۔ قطع نظر دوسری باتوں کے، ان مستعار الفاظ میں بھی لثوی نون اور ک کے درمیان مارفیم کی حد موجود ہے یا مادے میں ن اور ک کے درمیان مصوتہ ہے اس سے ہمارے مندرجہ بالا مفروضے کی پوری طرح تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی انکار، منکر وغیرہ مادہ نکر سے؛ انکسار، منکسر وغیرہ کسر سے؛ انکشاف منکشف وغیرہ کشف سے بنے ہیں۔ یہی حال اس قبیل کے دوسرے الفاظ کا ہے[2]

اب چونکہ ہم اپنے مفروضے کی تصدیق کر چکے ہیں، لثوی نون کے اس وتوع کو ایک آسان سے قانون کے ذریعے یوں پیش کر سکتے ہیں۔

$$-n-\begin{Bmatrix}k\\g\end{Bmatrix}- \rightarrow -n\,\|\begin{Bmatrix}k\\g\end{Bmatrix}- \quad (۸)$$

اس قانون میں لسانیات اور ریاضی کی بعض ابتدائی علامتوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ جدید لسانیات میں ریاضی اور منطق کی اصطلاحوں کا چلن عام ہو چکا ہے۔ یہاں ان متعلقہ علامتوں کی مختصر وضاحت کر دی جاتی ہے۔ چھوٹی لکیر (DASH) سے مراد ہے کہ اس مقام پر کوئی دوسری آواز یا آوازیں ہوں گی۔ ان کی نوعیت سے سر دست ہمیں سروکار نہیں۔ خطوط وحدانی میں جو آوازیں یعنی (ک) k اور g (گ) اوپر نیچے درج کی گئی ہیں، ان کا مطلب ہے کہ بیک وقت ان دونوں میں کوئی سی ایک واقع ہو سکتی ہے یعنی ک یا گ۔ دونوں ایک ساتھ نہیں آ سکتیں نیز دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ دونوں میں سے ایک کو ضرور لینا ہوگا۔ تیر کے نشان کا مطلب ہے "REWRITE" یعنی "دوبارہ لکھا جائے"۔ قانون کے دوسرے حصے میں ‖ سے مراد ہے مارفیم کی حد۔ اب پورے قانون کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی لفظ میں ک یا گ سے پہلے لثوی نون (n) بولا جاتا ہو تو اسے صوتیاتی تجزیے میں لثوی نون کے بعد مارفیم کی حد کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا جائے۔ یعنی زبان کے صوتیاتی نظام میں یہ بات بمنزلہ ایک حکم کے ہے کہ لفظ کے اندر لثوی نون ک گ سے پہلے نہیں آتا اور اگر آتا ہے تو اس کے اور ک گ کے درمیان مارفیم کی حد ہوتی ہے۔ قانون کے پہلے حصے میں k اور g کے بعد جو چھوٹی لکیر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بعد لفظ کا کچھ اور حصہ ہے یعنی لفظ ایک سے زیادہ صوتی رکن کا ہے۔ کیونکہ لثوی نون ک گ سے پہلے ایک صوتی رکن کے لفظ میں قطعاً نہیں آتا وہاں غشائی نون ہی آتا ہے۔ نیز اس قانون کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں بھی مارفیم کی حد ہوگی، وہاں نون کا تلفظ لازماً لثوی ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم اپنے قانون کے پہلے حصے کو دوسرے اور دوسرے کو پہلے کی جگہ پر رکھتے۔ آپ نے دیکھا کہ عام زبان میں جس بات کو بیان کرنے میں بیسیوں جملوں کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر بھی پوری تشفی نہیں ہوتی، ریاضی اور منطق کی مدد سے اسے محض چند علامتوں کے ذریعے نہایت صفائی اور قطعیت کے ساتھ صرف ایک سطر میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

لفظ کے اندر لثوی نون کے ک گ سے پہلے واقع ہونے پر مندرجہ بالا حکم لگا چکنے کے بعد شق (۵ ب) کے الفاظ کا الگ وجود خود بخود ختم ہو گیا۔ اب یہ تمام الفاظ شق (۵ الف) کے الفاظ کے ساتھ لائے جا سکتے ہیں۔ شروع میں لثوی نون کی توضیح میں جو کچھ ہم نے لکھا تھا کہ یہ بعض سب موقعوں پر آتا ہے، اب ان بقیہ موقعوں میں ایک موقع یہ بھی ہے کہ ک گ سے پہلے مارفیم کی حد کے ساتھ بھی آ سکتا ہے۔ اس طرح لثوی نون اور غشائی نون میں یکساں صوتی ماحول میں واقع ہونے سے جو تکرار پیدا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔ اب نون کی پانچوں شکلوں کا درجہ بندی نہایت آسانی اور سادگی کے ساتھ ایک ہی فونیم کے تحت کی جا سکتی ہے۔ یعنی (۱) دنتی نون (۲) معکوسی نون (۳) تالوی نون (۴) غشائی نون اور (۵) لثوی نون ایک فونیم "نون" کے پانچ الوفون قرار پائے۔ انھیں نقشے کے ذریعے یوں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] JEAN CANTINEAU. COURS DE PHONETIQUE ARABE (INCL. ET. Les de Linguistique Arabe: Memorial Cantineau, Paris, 196-X PP. 38-39

خاص شکریہ پروفیسر منصور، شعبہ عربی، وس کان سن یونیورسٹی کا، جنہوں نے کتاب کے متعلقہ حصوں کا ترجمہ فرانسیسی سے انگریزی میں میرے لیے پڑھ کر سنایا۔ جو یہاں سامی لسانیات کا درس دیتے ہیں۔ اس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

[2] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو:

Edward William Lane. Arabic-English Lexicon; London, 1863-93

	ت د سے پہلے	ٹ ڈ سے پہلے	چ ج سے پہلے	ک گ سے پہلے	بغیر موقوفوں پر (ویشترل ناژن (ں))
دنتی نون	✓				
معکوسی نون		✓			
تالوی نون			✓		
غشائی نون				✓	
لثوی نون					✓
					✓

اب دیکھا جا سکتا ہے کہ ان تمام آوازوں میں باہمی مجبوری ہے اور ایک کی جگہ پر دوسری آواز نہیں آ سکتی۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ لثوی نون غشائی نون کی جگہ ستعمال ہونے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ جہاں وہ ک گ سے پہلے آتا ہے وہاں اس کے اور ک گ کے بیچ میں مارفیم کی حد ہوتی ہے جو غشائی نون کا مخصوص ماحول نہیں۔ غشائی نون ایک صوتی رکن کے لفظ میں بھی ک۔ گ سے پہلے آ سکتا ہے (جنگ، رنگ، تنگ وغیرہ) جبکہ لثوی نون یک رکنی لفظ میں ک گ سے پہلے نہیں آ سکتا۔

ک گ سے پہلے لثوی نون کے اس مسئلے کا ایک اور حل بھی ممکن ہے۔ اتنی بات معلوم ہے کہ لثوی نون ایک صوتی رکن کے لفظ میں ک گ سے پہلے نہیں آ سکتا۔ جب بھی آتا ہے، دو یا اس سے زیادہ صوتی رکن کے لفظ میں آتا ہے (تنکا، منکا، انکار، انگان، نکھار)۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ ایسا صرف "صوتی رکن کی حد" (SYLLABLE BOUNDARY) کی وجہ سے ہوتا ہو۔ (دہ ب) اور (دہ ب) میں جتنے الفاظ پیش کیے جا چکے ہیں، ان سب میں ک یا گ اور ن سے پہلے صوتی رکن کی حد موجود ہے۔ ان مثالوں کے پیش نظر یہ اصول آسانی سے وضع کیا جا سکتا ہے کہ جہاں بھی ک گ سے فوراً پہلے رکن کی حد ہو وہاں لثوی نون ہی آئے گا (تنکا، انکار وغیرہ) اور جہاں یہ حد نہیں ہے وہاں غشائی نون آئے گا (جنگ، تنگ، رنگ وغیرہ) لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ ایک سے زیادہ رکن کے غشائی نون والے الفاظ مثلاً جنگلی، تنگی، وشنکیا وغیرہ میں رکن کی حد واضح طور پر قائم نہیں کی جا سکتی۔ اگر اس کی نشان دہی کی کوشش کی جائے تو تین حل سامنے آتے ہیں:

ا۔ یہ حد ن اور گ کے درمیان ہے یعنی [جن] [گی]

ب۔ یہ حد گ اور ی کے درمیان ہے یعنی [جنگ] [ی]

ج۔ یہ حد گ کے اوپر پڑتی ہے یعنی جنگی کہتے ہوئے گ کی آواز کا کچھ حصہ پہلے رکن کے ساتھ ادا ہوتا ہے اور کچھ دوسرے کے ساتھ۔

اگر (الف) کو صحیح مانا جائے اور اس کو غلط ثابت کرنا آسان بھی نہیں، تو اوپر جو اصول ہم نے وضع کیا ہے، وہ بے کار ہو جاتا ہے

کیونکہ یہاں نون اور گ کے درمیان صوتی حد ہے اور اس کے باوجود لثوی نہیں، غشائی نون ہی بولا جاتا ہے۔ دوسرا حل یعنی (ب) واضح طور پر صحیح نہیں کیونکہ جنگی، رنگی وغیرہ بولتے ہوئے کوئی بھی ی کو الگ سے نہیں بولتا۔ بلکہ ی اپنے سے پہلے کے مصمتے یعنی گ سے مل کر ہی ادا ہوتی ہے۔ رہا (ج) تو اس کے صحیح ہونے کا قوی امکان ہے۔ انڈیانا یونیورسٹی میں اپنے تحقیقی کام کے دوران میں میں نے اس سلسلے میں کئی ماہرین سے استفسار کیا۔ سب متفق تھے کہ رکن کا مسئلہ ہر زبان میں مختلف ہے اور اسے زبان کے پورے صوتیاتی نظام کی روشنی میں طے کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے بھی بیشتر نے اتفاق کیا کہ جنگی، تنگی جیسے لفظوں میں صوتی رکن کی حد واضح طور پر گ سے پہلے یا بعد میں نہیں، لیکن یہ بات کہ صوتی رکن کی حد گ پر پڑتی ہے، صرف تاثراتی طور ہی پر کہی جا سکتی ہے۔ انڈیانا میں مجھے سوناگراف (SONAGRAPH)، اسیلوگراف (OSCILLOGRAPH) اور وزیوکوڈر (VISIOCODER) کے استعمال کی سہولت میسر تھی اور اپنے دوسرے کاموں کے لیے میں ان مشینوں کو استعمال کرتا رہا ہوں، لیکن صوتی حد کا مسئلہ ان مشینوں کی مدد سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی میں بھی ڹ کی آواز ہے لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا وہاں چونکہ یہ آزادانہ آ سکتی ہے، صوتی حد کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس اردو میں ڹ بغیر ک گ کے آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس بات کا قوی امکان ہے کہ جنگی، تنگی وغیرہ الفاظ میں گ کی آواز کا شروع کا کچھ حصہ نون کے ساتھ ملا کر ادا ہوتا ہو اور اس کے بعد دوسرا صوتی رکن ساتھ ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہو۔ ممکن ہے آئندہ تحقیق سے یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہو جائے۔ اگر ایسا ہو سکا تو پھر اردو میں نون کا مسئلہ صوتیاتی کی سطح ہی پر طے ہو جائے گا اور مارفیم تک جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

نون سے متعلق اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے چند فروعی باتوں کا مختصر ذکر کر دینا بھی ضروری ہے۔ ایک یہ کہ لثوی نون کے علاوہ باقی چاروں نون ہم مخرج ہو کر آتے ہیں۔ ایسا صرف بندشی آوازوں کے ساتھ ہو سکتا ہے، س وغیرہ صفیری آوازوں کے ساتھ نہیں۔ سابقہ تحریروں میں یہ بات نظر انداز ہو گئی تھی جس کی وضاحت ڈاکٹر گیان چند نے "اردو نامہ" والے مضمون میں کر دی ہے جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ لیکن اب بھی وہ ش سے پہلے آنے والے "عقب لثوی نون" کو الگ ذیلی آواز قرار دیتے ہیں۔ اگر اس طرح کی تقسیم کو روا رکھا جائے تو پھر بقول پروفیسر مارٹن جوس کے ذیلی آوازوں کی کوئی حد ہی نہیں اور یہ تقسیم کہیں پر بھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ش سے پہلے نون ادا کرتے ہوئے نوک زبان ذرا سی اوپر کو جا کر

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

آفتاب شمسی

کسوٹی

جون کے تپتے مہینے میں مجھے
ہم کو احساس گرمی کا نہیں
آج کل میں جس مکاں میں ہوں مقیم
سرد رکھتی ہے اُسے برقی مشین
جس کی فرحت اور خنکی جسم کو
بخشتی رہتی ہے ہر دم تازگی
ہے مرا ماحول اتنا جانفزا
خود بخود ہوتا ہے دل کو یہ خیال
نظم ہو رومان پرور یا غزل
کچھ نہ کچھ تخلیق ہونا چاہیے
آج جب دی مجھ کو تپڑ اسرف
تم کچھ رنگینیاں ہونے لگیں
استراحت کے خنک لمحوں میں
چند ہی لمحات کی کاوش کے بعد
نظم اک انگڑائیاں لینے لگی
ہائے کیا الفاظ کیا رنگین علیم
کیسی تشبیہات کیسی بندشیں
کیا کنائے کیا اشارے کیا خیال
جیسے ہو الہام کی سی کیفیت
میں نے سوچا دیر کرنا ہے فضول
منہ کے کاغذ پر قلم پورا کر دوں
اپنا یہ شہکار یہ رنگین نظم
پر نہ جانے کیا ہوا ماحول کو
میں جو اُٹھا پینڈ لینے کے لیے

دفعتاً بجلی ہی غائب ہو گئی
اور کمرہ چند لمحوں میں مجھے
آگ کا دریا نظر آنے لگا
سارے کپڑے جسم کے تر ہو گئے
بو پسینے کی فضا میں گھل گئی
سخت گرمی سے گھٹا جب دم مرا
کھڑکیاں کمرے کی میں نے کھول دیں
دھوپ اور لو آ گھسے دالان میں
آگ کی جیسے اڑیں چنگاریاں
اور اس ماحول شعلہ بار میں
دیکھتا کیا ہوں کہ کچھ مزدور لوگ
آگ برساتے ہوئے سورج تلے
اپنے سروں پر لیے بیٹھے ہیں ٹوکریاں
گرم ڈامر کو سڑک پر ڈالتے
گا رہے ہیں کچھ عجب انداز سے
ان کو جب گاتے سنا تو دفعتاً
مجھ کو اپنی نظم یاد آنے لگی
ذہن کو لیکن نہ جانے کیا ہوا
وہ حسیں الفاظ وہ رنگیں خیال
ساری تشبیہات ساری بندشیں
اور وہ الہام کی سی کیفیت
آگ کا دریا بہا کر لے گیا
جھانک کر دیکھا جو میں نے ذہن میں
نظم کا کوئی نشاں باقی نہ تھا

قطعہ

نارائن داس باگی

واہ بندہ نوازیاں تیری
موت مانگی تو زندگی دے دی
جب ہوا زندگی کا میں طالب
اے خدا تو نے جان بھی لے لی

— — ۰ ۰ ۰ — —

پنجاب میں اُردو کالج کا قیام

مشرقی پنجاب کی انجمن ترقی اردو، ہر اردو دوست کے شکریہ و آفریں کی مستحق ہے کہ اس نے اس صوبہ میں جہاں سے اردو کا تقریباً سرکاری اخراج ہو چکا ہے اور اس کی جگہ ہندی اور پنجابی کو سرکاری زبانوں کا درجہ دیا جا چکا ہے ہمت نہیں ہاری اور تحفظ اردو کی مہم جاری رکھتے ہوئے اردو اسکول نہیں بلکہ اس سے بھی اعلیٰ و ارفع چیز اردو کالج ہے جو اس ریاست کا پہلا اردو کالج ہے شہر پٹیالہ میں قائم کر دیا۔ اس کالج کے قیام کی خبر تو خوشگوار ہے گرم تھی لیکن دوسرے صوبوں خصوصاً مرکز اور یوپی میں اردو والوں کی بے کلی و مرعوبیت شکست خوردہ ذہنیت کے پیش نظر یہ بدگمانی اور بدظنی تھی کہ کہیں یہ ساری خبر محض پروپیگنڈائی اور یا ہوائی ہی ثابت نہ ہو۔ پنجاب کے زندہ دل حامیان اردو جن میں کسی کے نام کے ساتھ کوئی اسلامی لاحقہ یا سابقہ مولانا، یا انصاری وغیرہ نہیں لگا ہے بلکہ جو سب کے سب غیر مسلم ہندو اور سکھ ہی ہیں نے اردو کی حقیقی تعمیری خدمت اس پہلے اردو کالج کے قیام کی شکل میں انجام دے دی اور اردو کے مستقبل کے بارہ میں جو یاس و ناامیدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہوئی تھی اس کو دور کرنے کیلئے ایک شمع امید روشن کر دی خدا اس شمع کو صرصر حوادث سے محفوظ رکھے کاش دوسرے صوبوں میں جہاں اردو حد کمال کو پہونچ چکی ہے یہ بے مثال حامیان اردو کی مرعوبیت اور مقدر پر راضی رہنے کی عادت میں انقلاب پیدا کر سکے خبر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نئے کالج کا افتتاح اس صوبہ کے کانگریسی وزیر تعلیم مسٹر ہربرہ چند نے کیا اور تقریر کرتے ہوئے یہ مژدہ بھی سنایا کہ ان تمام تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی جن میں طلبہ کی معقول تعداد اردو پڑھنا چاہے گی یہ اعلان یا تقریر اس زمانہ میں نکلا جب کہ یو پی کے اردو اخبارات میں متعدد شکایتی مراسلے اس مضمون کے نکل چکے ہیں کہ فیض آباد ہردوئی کے بعض دوسرے مقامات میں سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں اردو تعلیم کے خواہاں طلبہ کی معقول تعداد کی موجودگی اور اس سلسلہ میں حامیان اردو کی جد و جہد کے باوجود اردو تعلیم کو جاری کرنے سے انکار کر کے حکومت یو پی اور مرکزی حکومت دونوں کی صریح و واضح ہدایات کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور اردو دشمنی کے اس جذبۂ ناروا کی تخت کی جا چکی ہے جس کا تدارک اس وقت تک غیر ممکن ہے جب تک کہ حکومت اس تمرد و بغاوت کی قرار واقعی سزا ان ناشائستہ افراد کو نہ دے۔

اس نو قائم شدہ کالج کے متعلق انجمن ترقی اردو پنجاب کے فعال اور سراپا عمل کارکنوں نے اعلان کیا ہے کہ اس کالج کا انتظام خود انجمن ہی چلائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعتاً وہ اردو ہی کی تعلیم ہوگی اور اس سے جو طالب علم فارغ ہو کر نکلیں گے وہ مستقبل میں اردو کے خادم اور اس کی توسیع و اشاعت کے علمبردار ہوں گے۔

(ماخوذ از اداریہ سیاست جدید کانپور)

ڈاکٹر سید محمد عقیل

۲۶ر جنوری ۱۹۶۵ء اور اردو

۲۶ر جنوری ۱۹۶۵ء سے ہندوستان کی لسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ غیر ملکی زبان یعنی انگریزی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ اور ہندی یہاں کی سرکاری زبان قرار پاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تمام زبانوں کو اسی طرح بڑھنے اور پھیلنے کا موقع ملتا ہے جیسے کہ اپنے ملک اور وطن میں تمام انسانوں اور اپنی تہذیب کو اپنی تہذیب جو ایک طرح تہذیب ہے اور مختلف زبانوں کی طرح کشمیر سے راس کماری تک اور پنجاب سے آسام تک پھیلی ہوئی ہے اور جس کی رنگ برنگی پرچھائیاں یہاں کی چودہ زبانوں کے شعر و نغمہ، ناول اور افسانہ، لوک گیت اور رس بیند کے رگ و ریشے میں متحرک نظر آتی ہیں۔ اردو کی منزل اس لسانی تاریخ کے نئے باب میں کیا متعین ہوتی ہے، اب یہی یہ دیکھنا ہے۔ اب قاعدے سے ہمیں بھی دوسری زبانوں کی طرح پھلنے پھولنے کا موقع زیادہ ملنا چاہیے کیونکہ ہمارے بغیر ہندی اپنے ڈھنگ سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور اردو، ہندی کی مٹھاس کو جسے اس نے ہمیشہ حسب ضرورت اپنایا ہے سے لیے بغیر دلوں میں گھر نہیں کر سکتی اس طرح دونوں ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ ارباب حل و عقد کو دونوں کو ہر جگہ پڑھنے پڑھانے کی غیر مشروط سہولتیں بہم پہنچانی چاہییں اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کا یہی ایک واحد راستہ ہے۔ اب اس انکشاف سے کوئی فائدہ نہیں کہ کون بڑی زبان ہے کون چھوٹی۔ کون اچھی زبان ہے یا کس میں کیا کیا خرابیاں ہیں۔ ہندی میں ڈاکٹر رگھوبیر نے کیسے کھونڈے اور جبڑہ توڑ الفاظ ایجاد کیے ہیں۔ لسانی حیثیت سے کس کے پڑھنے اور سیکھنے میں کون کون سی خرابیاں یا آسانیاں ہیں ہندی دیہاتیوں کی زبان ہے اور اردو شہر والوں کی تہذیب زبان اور اسی کے ساتھ ساتھ فراق صاحب کی "لسانی بدتمیزی" "جب ہندی والوں سے پوچھتا ہوں" اور تھوڑے دن ہوئے اسی طرح کے مناظرے۔ اب کوئی وقعت نہیں رکھتے اور نہ اب اس سے کوئی تعمیری مقصد پورا ہوگا کیونکہ حکومت تھک ہار کر اس کا فیصلہ کرنے نہیں بیٹھی ہے کہ تم میں سے جو لڑ کر اپنی فضیلت ثابت کر دے گا اسی کی زبان اس ملک کی زبان ہوگی۔ حکومت اپنا فیصلہ کر چکی اور آپ بیٹھے یہی ثابت کرتے رہیے کہ ہندی میں یہ خرابی ہے اور اردو میں یہ خوبصورتی۔ خدا کا شکر ہے کہ مرارجی ڈیسائی جیسے ماہر لسانیات اس بات کا فیصلہ کرنے نہیں بیٹھے ورنہ بات معلوم نہیں کہاں سے کہاں پہنچتی۔ وہ جو بھی

کوان کا ایک مضمون نادرن انڈیا پتر کا الہ آباد میں 'قومی اتحاد بذریعہ ہندی' کے عنوان سے شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے بڑے دلچسپ انکشافات کیے ہیں۔ یہی کہ ہندوستان کی تمام جدید زبانیں سنسکرت سے متاثر ہیں لیکن اردو سنسکرت سے متاثر نہیں ہاں ہندی ضرور اردو سے متاثر ہے۔ اس بیان میں عام دیکھنے والے کو شاید کوئی خاص بات نظر نہ آئے لیکن اگر غور کیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی سی بات اردو میں نہیں اور چونکہ اردو کا رشتہ عربی فارسی سے بھی ہے اس لیے لوگ جانے کہاں کہاں بھٹک سکتے ہیں۔ ان کی عبارت حسب ذیل ہے

"Hindi language is understood by a majority of our people. Those who do not know it can pick it up easily because of the influence of Sanskrit on all Indian languages. Urdu is not influenced by Sanskrit but Hindi itself is influenced by Urdu."

مرارجی ڈیسائی ہندوستان کے سربرآوردہ لیڈر ہیں ان کی بات جلد عام لوگوں تک پہنچ جاتی ہے بھلا ان کے آگے ہندوستان کے ماہرین لسانیات کی کوئی کیوں سننے لگا ورنہ ڈاکٹر سنیتی کمار، سدھیشور ورما اور احتشام حسین کے حوالے دیے جاتے تاہم یہ بات ہم ان کی خدمت میں پیش کرتے ہیں کہ اردو میں ۷۵ فیصدی الفاظ ہندوستانی ہی ہیں جو سنسکرت ہی سے ٹوٹ پھوٹ کر آئے ہیں۔ اگر اپ بھرنش، اودھی، برج اور کھڑی بولی کا سلسلہ سنسکرت سے ملتا ہے تو اردو کا بھی یہی سلسلہ ہے اور پانی، کھیت، گھوڑا، پربت، اپج، دھیان، رن، پھول، پھل، سنگت جیسے ہزاروں الفاظ سنسکرت سے اردو میں بہت خفیف صوتی تغیر کے ساتھ داخل ہوئے ہیں جو ہندی میں بھی انھیں آوازوں کے ساتھ موجود ہیں اسی طرح فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اردو میں عام لوگوں کی زبان پر ہیں وہ ہندوستان کے مزدوروں سے لیکر پرشوتم داس ٹنڈن جی کے ان حلقوں تک میں بھی موجود ہیں جو انھوں نے کانگریس کی اردو رسم خط اور زبان کی مخالفت کے سلسلے میں لکھے تھے لیکن اس بحث سے اب فائدہ ہی کیا اگر مرارجی مان بھی گئے تو اردو کو کوئی خاص فائدہ نہ پہونچے گا۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ ہر چیز میں جب تک سنسکرت یا قدیم ہندوستانی تہذیب کی ملاوٹ نہ ہو وہ ہندوستانی نہیں ہو سکتی اس مفروضہ پر ہمیں تمام جدید سائنسی اور سماجی سہولتوں روایتوں اور چیزوں سے کنارہ کرنا ہوگا اس لیے کہ قدیم ہندوستان میں یہ مروجہ نہ تھے بیرونی اثرات

نیک نیتی سے اگر ہمارے رہن سہن میں داخل ہو گئے تو ہمارے ہو گئے ہیں ان کو بیرونی سمجھنا کم از کم نیک نیتی پر مبنی نہیں سمجھا جا سکتا۔

چھوڑیے اس بحث کو، ہمیں تو اب یہ کوشش کرنا ہے کہ وہ لوگ جو اردو کو ہندی کی ہی ایک شکل کہتے ہیں وہ ہندی کو ترقی دینے کے ساتھ ہندی کی اس شکل کو بھی اسی طرح ترقی دیں اور اسے سیکھنے کی آسانیاں فراہم کریں۔ تمام ہندی دوستوں کا اس ناتے یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اردو سیکھیں اور دوسروں کو سیکھنے میں مدد دیں اور حکومت کا فرض ہے کہ اپنے کارندوں پر دباؤ ڈال کر ان کی اردو دشمنی کی پالیسی کو ختم کرے۔ انھیں یہ بتائے کہ صاحب کو خوش کرنے کے لیے صحیح کام کو بھی غلط اور خراب کرنے کی کوشش کے جذبے کو اسی طرح بھول جائیں جس طرح وہ 'صاحب لوگوں' کو بھول گئے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائے کہ اردو سے دشمنی اب ہندی سے دشمنی ہے۔ اپنے اس معاندانہ رویّہ سے اردو کو زبردستی دبا کر وہ ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے ہیں جو ملک دشمنی کے مترادف ہے۔ ملک میں اتحاد اور میل محبت بڑھانے کے لیے ہم سب مل کر ہندی اردو پڑھیں اور بولیں کیونکہ یہی ملک کی عام زبانیں ہیں۔ ان کی ہر دلعزیزی نے عوام سے اگلے وقتوں میں بھی ایسے رشتے جوڑے ہیں کہ فارسی زبان نے بھی اپنے قواعد کی حدوں کو توڑ کر انھیں گلے لگانے کی کوشش کی ہے۔ سیکڑوں ترکیبیں اور الفاظ ایسے بنے جنھیں عوام نے اپنے مطلب کے لیے بنائے اور فارسی زبان کے اہل قلم کو بھی انھیں ماننا پڑا۔ وقائع اسد بیگ میں "دلاسا کردہ"، "درجھڑ کردہ" "دو پہرے در عام و خاص نشستہ بودند" "در دکن کٹہرہ ازل ایستادہ کردہ" "بہ قدر تسلی نمودند" "کہ خیریت، فقیر در آنست کہ دشمن مادر جائے دیگر بہ تفرس در آیند" "پس کمند ہنوز منجولہ بود و در بہاں منجولگی...." "....تنخواہ مرداریدز چوں عین برسات بودہ، دو گھڑی صبر نمایند" "مردم دکنی ماکہ پارہ پیدل بودند" "بہ سکھپال اقبال در آمدہ" جیسی ترکیبیں عام ہیں۔ یہ لسانی میل جول ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے جو ہندی میں ایسے الفاظ استعمال کرنے سے کنارہ کرتے ہیں جنھیں روزمرہ کی گفتگو میں وہ خود استعمال کرتے رہتے ہیں اور جنھیں ان کے گذشتہ ادیب بھارتیندو اور راجہ شیو پرشاد ستارہ ہند وغیرہ دھڑلے سے استعمال کرتے رہے ہیں۔ اردو والے بھی سمجھ لیں کہ ان کا اور بہت سے فارسی متقدمین کا اس سلسلے میں کیا رویّہ رہا ہے۔ چہ جائے کہ وہ فارسی ہندی ترکیبوں سے گھبراتے ہیں جب تک یہ سخت گیریاں ختم نہیں ہوتیں تب تک میل محبت سے مل جل کر آگے بڑھنے کی فضا پیدا نہیں ہوگی۔ اقتدار اور قوت کے زعم میں زیادہ تر غلط کام ہوتے ہیں۔ نشۂ قوت ہمیشہ خطرناک ہی ثابت ہوا ہے۔ ہندی والوں کو یہ سمجھنا چاہیے۔ پھر اس سے دلوں کا پانا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اسے تو صرف محبت ہی سے جیتا جا سکتا ہے اور محبت لین دین سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ صرف اپنی ہی بات منوانے سے نہیں۔

اب رہا رسم الخط کا مسئلہ۔ اگر رسم خط کے بیرونی ہونے سے کوئی خفا ہو تو اردو ہی کیوں مورد عتاب ہو، سندھی اور کشمیری کو بھی شامل کیجیے۔ پھر کچھ اور تہیں الٹ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ ہندی رسم خط بھی بیرونی ہے جو سامی نسل سے متعلق ہے۔ خاص طور پر جنوبی سامی سے جنوبی سامی تہ براہمی اور دوسری شکلوں میں چلتا ہوا یہ ہندی تک پہنچا ہے جس کا ثبوت آئزک ٹیلر (Isaac Taylor) جارج بوہلر (George Buhler) ڈیک (DEECKE) اور ڈرنگر (Diringer) جیسے ماہرین علم الخط کے یہاں موجود ہے جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ اب اگر یہ سوال ہوتا ہے کہ اردو رسم خط مشکل ہے اور ہندی آسان ہے تو کیا دنیا میں تمام مشکل چیزیں چھوڑ کر صرف آسان چیزیں ہی اپنائی جاتی ہیں؟ پھر آپ کا کیا نقصان ہے اگر لوگ مشکل ہی رسم خط سیکھنا چاہتے ہیں تو سیکھنے دیجیے آپ کو کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ یہ کوئی [illegible] تو نہیں ہے کہ آپ اسی طرح زبردستی اپنے کو اس پریشانی میں مبتلا کیے ہیں۔ اگر آپ کی نیت صاف ہے تو آپ بھی پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے جھگڑوں میں نہ پڑیے بلکہ انھیں کی طرح سوچیے کہ

> "اس احمقانہ جھگڑے کی وجہ سے بڑا غصہ اور تلخی پیدا ہوتی ہے اس لیے رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کر لیا جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دے دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں۔"

(میری کہانی مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صفحہ [illegible])

کیونکہ ان کے خیال کے مطابق

> "رسم الخط بدلنے کے ساتھ الفاظ کی شکلیں بدل جاتی ہیں، آوازیں بدل جاتی ہیں اور خیالات بدل جاتے ہیں۔ قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو جاتی ہے اور

۱؎ یہ مثالیں پروفیسر ظہیر الدین انصاری شعبۂ تاریخ الٰہ آباد یونیورسٹی کی مدد سے حاصل ہوئی ہیں جن کا میں شکر گزار ہوں۔ محمد عقیل۔

قدیم ادب ایک ایسی اجنبی زبان کا ادب بن کر رہ جاتا ہے جو مردہ ہو چکی ہے"

(میری کہانی صفحہ ۲۹۶-۳۱ مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین)

گاندھی جی نے بھی مرتے دم تک اردو ہندی کے مسئلے کو اسی طرح سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ میں ان کے اقوال اور اعلان کے چند جملے پیش کرتا ہوں جو ابھی لوگوں کے ذہن سے شاید محو نہ ہوئے ہوں گے۔

"۱۹۲۵ء میں کانگریس نے کانپور میں راشٹر بھاشا کو ہندوستانی نام دیا۔ دونوں لپیوں کی اجازت دی گئی اس لیے ہندی اور اردو کو راشٹر بھاشا مانا گیا۔ . . . . . اس لیے اگر راشٹر بھاشا کی پوری ترقی چاہیں تو ہمیں ہندی اور اردو کو اور دیوناگری اور فارسی لپی کو ایک جیسی جگہ دینی ہوگی"

"ہندی زبان جسے ہم ہندوستانی یا اردو بھی کہنے لگے ہیں اور جو دیوناگری اور اردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔ وہی ہماری زبان ہو سکتی ہے۔ جسے ہندوستان دونوں بول سکیں اور جو دیوناگری یا اردو لکھاوٹ میں لکھی جائے"

(ہریجن سیوک ۲۰ اپریل ۱۹۴۲ء مشترکہ زبان صفحہ ۵)

کسی صوبے یا ضلع یا جنتا پر ایک بھاشا یا ہندی کے ایک روپ کو لادنے کا جتن کرنا دیش کی سب سے بڑی بھلائی کے لیے زہر ہے۔

(ہریجن سیوک ۳۰ر جولائی ۱۹۴۶ء)

"اگر ہندی ساہتیہ سمیلن والے کہیں کہ ہم تو سنسکرت بھری ہندی ہی چاہیں گے تو میرے لیے سمیلن مر جاتا ہے"

(وردھا ۲۷ر فروری ۱۹۴۵ء بحوالہ مشترکہ زبان)

"میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آئندہ سے صوبہ متحدہ (اتر پردیش) کی سرکاری زبان ہندی دیوناگری رسم الخط کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دکھ ہوا۔ اتر پردیش میں جتنے مسلمان رہتے ہیں ان کے ایک چوتھائی صوبہ متحدہ میں رہتے ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کی طرح بہت سے ہندو ایسے ہیں جو اردو کے عالم ہیں کیا وہ اردو رسم الخط کو بھول جائیں؟ صحیح بات یہی ہوگی کہ دونوں رسم الخط کو قائم رکھا جائے اور سرکاری کاموں کے لیے ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لیا جائے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں رسم الخط کا سیکھنا لازمی ہو جائے گا. . . . . . . مساویانہ طریقہ یہی ہے کہ اردو رسم الخط کا بھی احترام کیا جائے"

(مشترکہ زبان صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲)

"ہماری قوم پرستی اگر دونوں رسم الخط سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت ادنیٰ قسم کی قوم پرستی ہے"

(۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ء بحوالہ مشترکہ زبان)

"قومی زبان کے متعلق یہ جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے کہ قومی زبان کیا ہو۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ ہندی ہوگی جو دیوناگری حروف میں لکھی جائے گی۔ میں تو کبھی بھی اس پر رضامند نہیں ہو سکتا. . . . . میں بہت سے ہندوؤں کو جانتا ہوں جو . . . . سنسکرت ملی ہوئی ہندی کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ دیوناگری رسم الخط میں لکھ سکتے ہیں"

(ہریجن ۲ر اگست ۱۹۴۷ء)

"لالہ لاجپت رائے میرے دوست تھے اور میں انھیں یہ کہہ کر چھیڑا کرتا تھا کہ آخر وہ کب تک خالص ہندی زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھیں گے۔ لالہ جی کہا کرتے تھے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے (حالانکہ وہ بہت پرجوش آریہ سماجی تھے) اس لیے کہ ان کی مادری زبان اردو ہے. . . . . کیا وہ (ہندی ساہتیہ سمیلن والے) ایک کل ہندوستان کی زبان کی خدمت کر سکتے ہیں اگر اردو رسم الخط اور اردو زبان کو اس سے خارج کر دیا جائے؟ میں ہمیشہ تو تمہارے پاس نہیں رہوں گا مگر تم میرے رخصت ہو جانے کے بعد میرے الفاظ کو یاد کرو گے. . . . . عدم رواداری مذہب کی نفی ہے"

(۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء بحوالہ مشترکہ زبان صفحہ ۲۲۱)

ان خیالات کے بعد ہمیں پھر لسانی مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے اور حکومت کو چاہیے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کو ان کے جائز حقوق دے کر ملک سے لسانی کشیدگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے تاکہ ہم ان مسائل پر غور کر سکیں جو ملک کی ترقی کے اہم مسائل ہیں اور جن سے عوام کی بہتری کی صورتیں پیدا ہوں اور ہندوستان اقوام عالم کے ساتھ علمی سائنسی اور تہذیبی دوڑ میں ایک اہم مقام حاصل کر سکے نہ یہ کہ آئے دن لسانی مسئلوں سے دست و گریباں رہے۔

ہندوستان میں ۲۳۳۲۳۵۱۸ لوگ اردو بولتے ہیں

اگر تعداد کوئی اشارہ ہے تو اردو ہندوستان کی چھٹی سب سے زیادہ اہم زبان ہے

محکمہ مردم شماری نے مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد کے جو اعداد شمار شائع کیے ہیں ان کے بموجب ملک کی ۴۴ کروڑ کی آبادی میں دو کروڑ ۳۳ لاکھ ۲۳ ہزار ۵ سو اٹھارہ افراد اردو زبان بولتے ہیں اور ۲۰ لاکھ ۵ ہزار ۵ سو اسّی افراد اس کو اپنی ثانوی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے ہیں۔

محکمہ مردم شماری نے جو اعداد شمار جاری کیے ہیں ان کے بموجب مختلف زبانیں بولنے والے افراد کی تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) ہندی :-	۱۳۳۴۳۵۴۵۰
(۲) تلیگو :-	۳۷۶۶۸۱۳۲
(۳) بنگالی :-	۳۳۸۸۸۹۳۹
(۴) مراٹھی :-	۳۳۲۸۶۷۷۱
(۵) تامل :-	۳۰۵۶۲۶۹۸
(۶) اردو :-	۲۳۳۲۳۵۱۸
(۷) گجراتی :-	۲۰۳۰۴۴۶۴
(۸) کنڑی :-	۱۷۴۱۵۸۲۷
(۹) ملایالم :-	۱۷۰۱۵۱۸۲
(۱۰) اڑیا :-	۱۵۷۱۹۳۹۸
(۱۱) پنجابی :-	۱۰۹۵۰۸۲۶
(۱۲) آسامی :-	۶۸۰۳۴۶۵
(۱۳) کشمیری :-	۱۹۵۶۱۱۵
(۱۴) سنسکرت :-	۲۵۴۴

اس کے علاوہ اردو کو ملک کی ۷ ریاستوں میں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ ان میں سے تین ریاستوں یعنی آندھرا (۷ء۷۰ فیصدی) گجرات (۲ء۸۸ فیصدی) اور مہاراشٹر (۶ء۸۹ فیصدی) میں اردو کو دوسری سب سے اہم زبان کا درجہ حاصل ہے اور ۴ ریاستوں یعنی بہار (۸ء۹۲ فیصدی) میسور (۸ء۶۳ فیصدی) پنجاب (۱ء۲۶ فیصدی) اور اتر پردیش (۱۰ء۷۰ فیصدی) میں اس کو تیسری سب سے اہم زبان کا درجہ حاصل ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ملک کی تین ریاستوں یعنی آندھرا، گجرات اور میسور میں اردو زبان کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے ان ریاستوں میں ہندی بولنے والے تیسرے درجہ ہو کر میں پیدا ہوا مہاراشٹر میں گو کہ ہندی بولنے والے اس درجہ میں ہیں لیکن ان کی تعداد اردو بولنے والوں سے کم ہے۔

مہاراشٹر میں صرف ۱۱ء۳ فیصدی لوگ ہندی بولتے ہیں جبکہ ۶ء۸۹ فیصدی لوگ اردو بولتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جس ریاست میں اردو بولنے والوں کی سب سے بڑی فیصدی تعداد ہے یعنی اتر پردیش میں (۷۰ء۱۰ فیصدی) وہاں اردو کو تیسرا درجہ حاصل ہے۔

مدھیہ پردیش اور کشمیر میں اردو بولنے والے اتنے کم ہیں کہ اردو وہاں ۱۳ اہم ترین زبانوں کے زمرہ میں نہیں آسکی ہے۔

(قومی آواز لکھنؤ)

انجمن پٹیالہ کا خبرنامہ

پٹیالہ ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء انجمن ترقی اردو پٹیالہ کی ماہانہ نشست حسب معمول ۳۰ جنوری ۱۹۶۵ء کو زیر صدارت مولنا اکبر احسنی گنوری اسٹیٹ بنک آف پٹیالہ میں منعقد ہوئی جس میں مولنا اکبر احسنی گنوری اور جناب بسمل کپورتھلوی کے علاوہ مقامی شعراء حضرات اہل ذوق اور معززین شہر نے بھرپور حصہ لے کر اپنے ذوق سخن اور اردو سے ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مقامی شعراء حضرات کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

پروفیسر کرپال سنگھ بیدار۔ نوبہار صابر۔ ہرنس سنگھ تاج زار انبالوی۔ ساحر سنامی۔ ساغر شفائی۔ جیش پٹیالوی۔ جگر جالندھری۔ راج دیوانہ۔ پریم حسرت۔ سوز شرمن۔ برج لال کوہلی نازاں۔ جوہر نیش راحت اور شباب۔

(جیش پٹیالوی پبلسٹی سکریٹری)

پریس کے لیے بیان

پنجاب سرکار کو چاہیے کہ وہ اردو کو بھی ہندی اور پنجابی کے ساتھ ساتھ لازمی قرار دے۔ اردو آج بھی پنجاب بھر میں سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ پنجاب میں اردو یونیورسٹی ضرور ہونی چاہیے، کیونکہ یہاں کی تو یہ عام فہم زبان ہے پنجاب سرکار فوراً دھیان دے۔

(مہابیر پرشاد مکل شاد۔ صدر انجمن ترقی اردو شاخ کیہ منڈی پنجاب)

(بقیہ صفحہ ۴ کا)

لگتی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے "عقب لثوی" کہہ لیں، لیکن اس کی نوعیت پھر بھی لثوی ہی ہے۔ اس لیے میں نے اسے الگ سے اپنے خاکے میں جگہ نہیں دی۔

دوسرے یہ کہ نون بندشی آوازوں کے ساتھ ہم مخرج ہو کر آتا ہے لیکن میں نے زیر نظر مضمون میں لبی بندشی آواز کے ساتھ ہم مخرج ہونے والے نون (گنبد، انبساط وغیرہ) کو نہیں لیا۔ ان الفاظ میں نون م کی آواز دیتا ہے اور چونکہ م اردو میں اپنا آزادانہ وجود رکھتا ہے یعنی الگ سے فونیم ہے۔ اس سلسلے میں اس کا ذکر م ہی کے ساتھ کرنا پسند کروں گا۔ ایسا نہ کیا جائے تو درجہ بندی میں ایک آواز کو خواہ مخواہ دوسری کی حدود میں داخل کرنے (OVER LAPPING) کا الزام عائد ہوگا۔

تیسرے یہ کہ ق اگرچہ بندشی آواز ہے، نون اس سے ہم مخرج ہو کر نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ ق عربی سے مستعار ہے۔ عربی کے جن الفاظ میں ق نون کے فوراً بعد آتا ہے، وہ لثوی نون ہی سے بولے جاتے ہیں۔ اردو میں یہ خصوصیت برقرار رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان الفاظ میں بھی انکار، منکر وغیرہ کی طرح ن اور ق کے درمیان مارفیم کی حد موجود ہے یا مادے میں مصوتہ ہے۔ چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۹) انقباض۔ انقسام۔ انقیاس۔ منقسم۔ انقطاع۔ منقطع۔ منقوط۔ منقوش۔ منقبت۔ منقار۔ منقول۔ منقا۔ انقلاب۔ منقلب۔ منقش۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جدید لسانیات میں آوازوں کا تجزیہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اصولوں سے "مشعل راہ" (GUIDING PRINCIPLES) کا کام لیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان کی دنیا میں کوئی ایک آواز (PHONE) دوسری آواز سے سو فی صد مطابقت نہیں رکھتی۔ ماہر لسانیات کا کام یہ ہے کہ ان مختلف آوازوں کے باہمی ربط کا پتہ چلائے اور ان کی درجہ بندی کرتے ہوئے انھیں بنیادی صوتیاتی اکائیوں یعنی فونیم میں اس طرح اسیر کرے کہ زبان کے صوتیاتی نظام کی پوری تصویر سامنے آجائے۔ فونیم کی تعداد جتنی کم ہوگی مستحسن سمجھی جائے گی۔

۲۔ زبان میں آوازیں ایک نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔ اگر اس نظام کے کسی اصول سے روگردانی کی کوئی مثال ملے تو اس کا تجزیہ پورے نظام کی روشنی میں کرنا چاہیے نہ کہ اس کی خاطر نظام ہی کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔

۳۔ صوتیات کوئی بالذات چیز نہیں۔ زبان کے "تہ دار درجے" (HIERARCHY) میں اس کی حیثیت صرف ایک "سطح" (STRATUM) کی ہے۔ اس کی پیچیدگیوں کا حل تلاش کرنے کے لیے زبان کی دوسری "سطحوں" یعنی صرفیات، نحو وغیرہ سے بھی مدد لی جا سکتی ہے۔

۴۔ صوتیاتی تجزیے کے نتائج جتنے زیادہ واضح قوانین کی مدد سے پیش کیے جا سکیں، اتنا اچھا ہے۔

۵۔ زبان کا ہر صحیح الذہن بولنے والا اپنی زبان کے صوتیاتی نظام کا گہرا وجدانی احساس (INTUITIVE FEELING) رکھتا ہے جس کی بدولت وہ اپنی زبان کے استعمال پر قادر ہے۔ صوتیاتی تجزیہ سب سے بہتر وہ ہے جس میں زبان بولنے والے کے اس وجدانی احساس سے مطابقت پائی جائے۔

ان پانچ "رہنما اصولوں" کی روشنی میں دیکھا جائے تو نون کو دو فونیم کے طور پر پیش کرنے والا سابقہ نظریہ ہر لحاظ سے غیر مستحسن قرار پاتا ہے جبکہ زیر نظر مضمون میں پیش کیا گیا نظریہ نہ صرف اردو سے متعلق ہمارے "وجدانی احساس" کا ساتھ دیتا ہے اور زبان کے فطری رجحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے نتائج کو واضح طور پر پیش کرتا ہے بلکہ لثوی نون (ن) اور غشائی نون (ڱ) کی مصنوعی اور من گھڑت تفریق کو بھی ختم کرتا ہے، اور اردو کی کل فونیم کی تعداد کو کم کرنے میں بھی مدد دیتا ہے۔٭

انجمن ترقی اردو شاخ بیکانیر کی جدوجہد

انجمن ترقی اردو شاخ بیکانیر کے جدید انتخابات کے بعد طریقۂ کار اور لائحہ عمل میں کافی اصلاح کی گئی جس کے بعد نئی امنگ اور بھرپور ولولے کے ساتھ ممبران و عہدیداران نے اردو کی خدمت کے لیے واضح پروگرام مرتب کیا۔ چنانچہ سب سے پہلے ایک پرائمری اسکول کھولا گیا ہے جہاں اردو تعلیم مفت دی جاتی ہے بلکہ مستحق طلباء اور طالبات کو کتابیں بھی بلا قیمت دی جاتی ہیں۔ نیز اتفاق رائے سے کیا گیا ہے کہ امسال کل راجستھان اردو سمپوزیم بھی بیکانیر میں منعقد کیا جائے۔ جس کے انتظامات شروع کر دئے گئے ہیں۔ اور بانی انجمن اس سلسلے میں پورا پورا تعاون دے رہی ہے۔

انجمن کے خاص عہدیداران حسب ذیل ہیں:

جناب ظفر محمد خاں صاحب	صدر
" مرزا شاہ رخ صاحب	نائب صدر
" خلیل احمد صاحب خلیل صمدانی ایڈوکیٹ	سیکریٹری
" گلاب چند صاحب راہی	نائب سیکریٹری
" بشیر احمد صاحب	خازن

٭ اس مضمون کے بنیادی خیال پر کام کی ابتدا ان دنوں دوسرے کاموں کے انڈیانا یونیورسٹی بلومنگٹن کے انسٹی ٹیوٹ آف لنگوسٹکس میں ہوئی تھی جس میں میری شرکت فورڈ گرانٹ کی رقم سے ممکن ہو سکی۔ اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

مراسلات

ڈاکٹر اقبال کی ایک تنقید

ہماری زبان ۸ دسمبر ۱۹۶۴ء صفحہ اول پر نادم سیتاپوری "ڈاکٹر اقبال کی ایک تنقید" کے تحت فرماتے ہیں "لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کا پہلا مجموعہ کلام تقریباً چالیس سال ادھر پہلی بار صدیق بک ڈپو لکھنؤ کی طرف سے گلکدہ کے نام سے شایع کیا گیا تھا...... میری نظر سے بہت دن ہوئے گلکدہ (طبع اول) کا جو نسخہ گزرا تھا وہ ناقص الطرفین تھا اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس میں صرف اکبر الہ آبادی کے کسی خط کا حوالہ دیا گیا تھا" الخ۔

میں عرض کرتا ہوں کہ گلکدہ کا پہلا ایڈیشن محمد جواد کے اہتمام سے نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ میں چھپا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۳ء میں صدیق بک ڈپو امین آباد لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔

جب نادم صاحب خود فرماتے ہیں کہ وہ ناقص الطرفین تھا تو اس میں کسی کی رائے نہ ہونا تعجب کی بات نہیں اگر اس میں شروع کے صفحات ہوتے تو نادم صاحب کو تمام بزرگوں کی رائیں مصنف کے حالات زندگی شاگردوں کے ساتھ ساتھ شاگردوں اور ان کی دیگر تصانیف کے نام بھی ملتے۔ میرے سامنے دونوں ایڈیشن موجود ہیں۔

نادم صاحب نے ہفت روزہ الواعظ لکھنؤ کے حوالے سے اقبال مرحوم کے خط کا اقتباس پیش کیا ہے وہ دونوں ایڈیشنوں میں اس طرح ہے۔

"میں آپ کے کلام کو منتظر استفادہ دیکھتا ہوں
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں۔ موجودہ ادبیات اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعہ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے میں نے اسے پنجاب یونیورسٹی کے امتحان آنرز ان اردو کے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے آپ کے کلام کی قدر و منزلت حیرت انگیز ہے کیوں نہ ہو آخر خاک پاک شیراز و کشمیر سے آپ کو نسبت ہے۔"

اور عبارت جو صدیق بک ڈپو کے اشتہار سے آپ نے نقل فرمائی ہے مجھے وہ عبارت اور لطف یہ ہے کہ ان کے ایڈیشن میں بھی بقیہ عبارت نہیں، تسلیم کرنے میں تامل ہے کیونکہ صدیق بک ڈپو کو اصل خط کہاں سے ملا۔

اور شروع کا یہ کہ خود ڈاکٹر اقبال حضرت عزیز کا کلام بہ نظر استفادہ دیکھتے تھے کیوں حذف کر دیا۔

"بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کیلئے"

واقعہ یہ ہے کہ صدیق بک ڈپو والا ایڈیشن مصنف کی وفات کے بالکل بعد شایع ہوا اور اسی کی نقل ہے جو ۱۹۳۳ء میں شایع ہوا تھا۔ اہل مطبع نے جہاں لکھائی چھپائی اور کاغذ کی نفاست کا خیال رکھا وہاں تصحیح کی کمی بری طرح کھٹکتی ہے۔

پہلے ایڈیشن میں حضرت عزیز کی تصویر نہیں۔ صدیق بک ڈپو نے ایک تصویر جو کبھی شباب اردو لاہور میں شایع ہوئی تھی اپنے ایڈیشن کی زینت بنا دی۔

اب میرے دعوے کی چند دلیلیں ملاحظہ فرمائیں۔

دوسرا ایڈیشن پہلے ایڈیشن کی نقل ہے صرف فرق اتنا ہے کہ پہلے ایڈیشن میں ۱۳ شاگردوں کے نام ہیں اور دوسرے میں ۱۴ کے اور انھیں ۱۴ میں جناب شیام موہن جگر بریلوی کے نام کا اضافہ ہے یہی حال تصانیف کی فہرست میں کمی کا ہے اور تصحیح کی کمی کا اندازہ کرنے کے لیے چند مثالیں حاضر ہیں۔

پہلا ایڈیشن صفحہ ۲۵ سے

وقت نظارہ رہی میری پریشاں نظری
جب کہیں سلسلۂ زلف پریشاں سمجھا

دوسرے ایڈیشن میں پریشاں نظری کی بجائے پریشانی نظری چھپا ہے۔

پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۹

ہر داغ دل ہے گویا تاریخ سیر گلشن
جلوے ہیں دو شکلوں کے پیدا اسی چمن میں

دوسرے ایڈیشن میں دوسرا مصرع یوں چھپا ہے

جلوے ہیں دو شکلوں کے اس اسی چمن میں

پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۰۲

وہ سو گئے اور کہتا رہا میں
اٹھو اٹھو کہ ابھی رات کم ہے

دوسرے ایڈیشن کے صفحہ ۱۵ پر ہے

وہ سو گئے اور میں کہتا رہا

یہاں وزن شعر بدل گیا۔ سالم کی جگہ رکن محذوف آگیا یعنی ایک سبب خفیف کی کمی ہوگئی۔

افسوس کہ گلکدہ کا وہ نسخہ جو مصنف نقادوں کی استفادہ کے بعد حضرت عزیز نے اصلاح کر کے رکھا تھا، شاد مرحوم نے دیکھا تھا لیکن اب وہ وارثان کے پاس بھی نہیں شاید آغا شاعر کے پاس ہو۔

(خلد لال بربا آمر)

جواب استفسار

۸ر فروری کے "ہماری زبان" میں جناب شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے جو معلومات دریافت فرمائی ہیں ان کے جوابات یہ ہیں

۱۔ جناب نادم سیتاپوری کا پتہ محلہ تقضیارہ سیتاپور (یو۔پی) ہے۔

۲۔ اخبارات و رسائل کے سلسلے میں اردو صحافت پر پہلی کتاب اشرف کی "اختر شہنشاہی" ہے۔ یہ ۱۸۸۸ء میں اختر پریس لکھنؤ سے شایع ہوئی تھی۔ یہ کتاب اب کمیاب ہے البتہ بعض لائبریریوں میں اس کے نسخے موجود ہیں۔ علی گڑھ میں مولانا آزاد لائبریری اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند میں اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ اردو اخبارات و رسائل کا ایک مختصر تذکرہ ہے کتاب ۲۹۹ صفحات پر مشتمل ہے

دوسری کتاب "فہرست اخبارات ہند" ہے جس میں تمام ہندوستان کی ہر زبان کے ۴۲۰ اخبارات و رسائل کے نام معہ مقام زبان تاریخ اشاعت وغیرہ کے درج ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں کارخانہ پیسہ اخبار کے خادم العلم اسٹیم پریس لاہور سے شایع ہوئی تھی۔ یہ کتاب ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

ان دو کتابوں کے علاوہ انجمن ترقی اردو ہند نے حال ہی میں اردو صحافت پر دو کتابیں "ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)" اور "صوبہ شمالی کے اخبارات و مطبوعات" (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء) شایع کی ہیں۔ ان کے مرتب محمد عتیق صدیقی ہیں۔ ان میں اول الذکر آپ کے موضوع سے متعلق ہے۔

ان کے علاوہ "اردو صحافت" پر ایک مضمون قاضی عبدالغفار کا "نگار" میں چھپا تھا۔ غالباً یہ مضمون ۱۹۴۳ء میں چھپا تھا۔

(ایم حبیب خاں)

یہ شعر کس کے ہیں

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی — بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی انتخاب میں یہ اشعار تسکین دہلوی دشاگرد مومن) کے نام سے میں نے دیکھے تھے لیکن اب شک پیدا ہو گیا ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی صاحب ان اشعار کے صحیح مصنف کی نشان دہی فرمائیں۔ (خریدار ۲۸)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر ضمیرالدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا۔ اور پبلشر نذیر حسین نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شایع کیا